رائج نصابِ درس نظامی کا عصری تقاضوں اور مفکرین ہند کی آراء کی روشنی میں تنقیدی جائزہ

Critical Review of the Current Curriculum of Dars-e-Nizami in the Light of Modern Age Needs and Educational Theories of the Sub-Continental Thinkers

*عبید اللہ

** عرفان اللہ صابر

ABSTRACT

The curriculum taught in the traditional religious schools of the subcontinent is known as Dar-e-Nizami. Its founder was Mullah Nizam-ud-din (1748), who developed a new curriculum for the educational institutions of the subcontinent of that time and tried to include all the subjects according to the needs and priorities of the time. In this course outline of the madrassa education system about forty books were taught in thirteen subjects. Having a religious basis and being free of any expenses, it has been recommended as a popular education system in the subcontinent. The world's educational history shows that all types of curriculums need amendments with the passage of time according to the needs of the day. In this regards many Muslim thinkers of the subcontinent have given their theories to change this Madrassa Curriculum of traditional education to meet the needs of the time. This article discusses the above-mentioned theories and their application. The following issues will be investigated in this study:

1. What are the differences between the old and modern curriculum of the Darse-e-Nizami?
2. The needs and importance of teaching Darse-e-Nizami curriculum.
3. Subcontinental thinkers' opinion for changing the curriculum of the Madrassa education system (Dars-e-Nizami).
4. Current needs and Dars-e-Nizami (Determinations of priorities)

KEY WORDS:

Dars-e-Nizami, Madrassa education, Curriculum, Sub-Continental Thinkers.

* ایم فل اسکالر، شعبہ علوم اسلامیہ، قرطبہ یونیورسٹی سائنس اینڈ انفارمیشن ٹیکنالوجی، ڈیرہ اسماعیل خان

** فاضل درس نظامی، دار العلوم کراچی، کراچی

برصغیر پاک وہند میں درس نظامی نصابِ تعلیم کو مذہبی تعلیمی بنیادیں رکھنے کی وجہ ہمیشہ ایک خاص اہمیت حاصل رہی ہے۔ اس نظام تعلیم میں جہاں دیگر کئی ایک خواص پائے جاتے ہیں، وہاں اس کی پزیرائی کی ایک بڑی وجہ اس کا خالصتاً مفت ہونا ہے۔ زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ جہاں ترجیحات میں تبدیلیاں وقت کی ضرورت ہوتی ہیں، وہیں نصاب تعلیم کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا بھی ایک ایسی ہی ضرورت ہے کہ جس سے روگردانی کرنے والی اقوام ہمیشہ خسارہ میں رہی ہیں۔ اس انتہائی اہمیت کی حامل ضرورت کے پیش نظر برصغیر کے نامور مسلم مفکرین جن میں سر سید احمد خان، شیخ الہند مولانا محمود الحسن، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا مناظر احسن گیلانی، ابو الاعلیٰ مودودی و دیگر مفکرین نے رائج نصاب تعلیم میں وقت کے تقاضوں کے پیش نظر تبدیلی کے نظریات پیش کئے۔ چونکہ موجودہ درس نظامی نصاب تعلیم میں طب، تصوف، زراعت، انجینئرنگ، آئی ٹی و دیگر کئی ایک شعبوں سے متعلق نصاب کو شامل تعلیم نہیں کیا گیا جو نہ صرف وقت کی ضرورت ہیں بلکہ کسی نظام مملکت کو بنیادیں فراہم کرنے والے ایک نظامِ تعلیم کی بنیادی ذمہ داری بھی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ درس نظامی کے فارغ التحصیل طلبہ مسجد اور مدرسہ تک ہی محدود ہو کر رہ گئے ہیں، جس سے جہاں عصری تعلیمی اداروں اور دینی مدارس کے فضلاء کے درمیان ایک خلیج پیدا ہو چکی ہے، وہاں دینی مدارس کے فضلائے کرام میں احساس کمتری پیدا ہونا شروع ہو گیا ہے۔

مدارس اسلامیہ کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی کہ مذہب اسلام کی، کیونکہ اگر اسلامی تاریخ کے اولین ادوار پر نظر دوڑائی جائے تو دارِ ارقم اور صفہ دو ابتدائی متعین مدارس نظر آتے ہیں، جبکہ ان کے علاوہ غیر متعین درس گاہوں کی تعداد میں تو کئی ایک مقامات جن میں شعبِ ابی طالب، صحنِ ابی بکرؓ، مسجدِ قبا اور مکانِ سعدہ ضرارہؓ وغیرہ شامل ہیں۔ بعینہٖ اگر برصغیر میں مدارسِ اسلامیہ کے ارتقاء و تاریخ پر نظر دوڑائی جائے تو یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ سندھ میں اسلام کے داخلے کے ساتھ ساتھ مدارسِ حدیث بھی قائم کئے گئے، اس لحاظ سے برصغیر میں مدارسِ اسلامیہ کی تاریخ بھی تقریباً اتنی ہی قدیم ہے جتنا کہ یہاں مذہبِ اسلام ہے۔ لیکن برصغیر کے ایسے مدارسِ اسلامیہ جنہیں حکومتی سطح پر سرپرستی حاصل رہی، کی تاریخ تیرہویں صدی عیسوی سے شروع ہوتی ہے، جس کا تذکرہ قاری محمد حنیف جالندھری ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> "جنوبی ایشیاء میں مسلمانوں کے باقاعدہ تعلیمی نظام اور مدارس کی ابتداء قطب الدین ایبک (۱۲۱۰ء) کے عہد میں ہوئی۔ اس دور میں سینکڑوں مساجد تعلیم و تدریس کا مرکز تھیں، جن میں دینی علوم کے علاوہ دنیاوی علوم کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ مساجد کے علاوہ امراء کی حویلیوں، چوپالوں اور خانقاہوں میں بھی درس و تدریس کا سلسلہ جاری تھا سلطان ایبک کی طرف سے علماء کی سرپرستی ضرب المثل تھی۔ پھر سلطان شمس الدین التمش (۱۲۳۶ء) نے کئی مدارس قائم

کئے۔ وہ اہل علم کا ذبر دست قدر دان تھا۔ فیروز شاہ تغلق (۱۳۸۸ء) نے تیس اعلیٰ تعلیمی ادارے قائم کئے اور پہلے سے قائم مدارس کی مرمت اور روزمرہ اخراجات کے لئے فنڈز مختص کئے۔ خلجی سلاطین کا زمانہ حکومت (۱۲۹۶ء تا ۱۳۱۵ء) اسلامی تعلیم و تدریس اور علم پروری کے حوالے سے خصوصی شہرت رکھتا ہے۔ اسی طرح سلطان سکندر لودھی کا عہد (۱۴۸۹ء تا ۱۵۱۰ء) اسلامی تعلیم و تدریس کی سرپرستی کے حوالے سے قابلِ ذکر ہے۔ مغلیہ دور کے تمام سلاطین اور مغل امراء کی علم دوستی کے نقوش تاریخ کی کتابوں میں جگمگا رہے ہیں۔ جلال الدین اکبر (۱۶۰۵ء) نے ان پڑھ ہونے کے باوجود نہ صرف متعدد مدرسے قائم کئے، بلکہ کتب خانوں کی بنیاد بھی ڈالی۔ شہنشاہ جہانگیر (۱۶۲۸ء) نے دینی مدارس قائم کرنے کے علاوہ انہیں ترقی دینے اور آمدن کے مستقل ذرائع برقرار رکھنے کے لئے یہ فرمان جاری کیا کہ "اگر کوئی امیر یا بیرونی تاجر لاوارث مر جائے تو اس کا مال و دولت بنام سلطنت منتقل کر کے مدرسوں پر خرچ کیا جائے۔"[1]

اس سے یہ بات مکمل طور پر واضح ہو جاتی ہے کہ برصغیر میں موجودہ "مدرسہ ایجوکیشن سسٹم" کی بنیادیں اور تاریخ صدیوں پرانی ہے۔ موجودہ دور کے مدارس اسلامیہ میں جو نصاب رائج ہے، اسے درس نظامی نصاب تعلیم کے نام سے شہرت حاصل ہے۔ جو استاذ الہند ملا نظام الدین محمدؒ انصاری فرنگی محلی (م ۱۱۶۱ھ / ۱۷۴۸ء) کا مرتب کیا۔ ملا نظام الدین سہالوی کا تعلق لکھنؤ سے ۳۲ کلو میٹر دور بستی سہالہ سے تھا۔ اس خاندان کے سربراہ ملا قطب الدین کو بستی سہالہ کے کسی زمیندار خاندان نے ایک مقامی جھگڑے میں شہید کر دیا تو یہ خاندان ہجرت کر کے لکھنؤ آباد ہو گیا[2]۔ محمد رضا انصاری کے مطابق سلطان اورنگزیب عالمگیر کے دور میں ایک انگریز تاجر لاوارث فوت ہوا (جبکہ علامہ شبلی کے مطابق یہ فرانسیسی تاجر جب واپس چلا گیا) تو مغل حکومت نے اس کی کوٹھی کو اپنے قبضہ میں لے لیا تھا جو "فرنگی محل" کے نام سے مشہور تھی۔ بعد میں یہی کوٹھی ملا نظام الدین سہالوی کے خاندان کے حوالے کی گئی اور اس علمی خاندان نے اس میں "مدرسہ فرنگی محل"[3] کے نام سے اس عظیم دینی درسگاہ کی بنیاد رکھی، جس کی خدمات کسی سے پوشیدہ نہیں۔ یہاں اس مغالطہ کی اصلاح بھی ضروری ہے کہ اردو دان طبقہ میں درس نظامی نصاب تعلیم کو مدرسہ نظامیہ بغداد سے جوڑا جاتا ہے، جو کہ غلط اور اس بابت مقالاتِ شبلی میں بھی وضاحت موجود ہے[4]۔

کسی بھی قوم کے مسائل کا سب سے بہترین حل، علمِ نافع کے حصول میں ہے۔ اسلئے بلا قیدِ زمان و مکان نصاب تعلیم کو ہمیشہ بنیادی حیثیت حاصل رہی ہے۔ کیونکہ نصاب کا براہ راست تعلق ضروریاتِ زمانہ حال اور مستقبل سے ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تعلیم و تعلم اور معصریت کو علیحدہ علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ جناب نذر الحفیظ (ندوۃ العلماء۔ لکھنؤ) رقمطراز ہیں کہ "نصابِ تعلیم کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ جو معاشرے کے چیلنج ہوتے ہیں، جو مشکلات ہوتی ہیں۔ نصابِ تعلیم

ان کو حل کرنے کی صلاحیت انسان کے اندر پیدا کرتا ہے۔"[5] نصابِ تعلیم کی اہمیت کی بنیادی وجہ ہی یہی ہے کہ یہ معاشرے سے جہالت کو ختم کرنے کے ساتھ ساتھ معاشرتی ضروریات اور معصریت کے تقاضوں کو پورا کرتا ہوا نظر آتا ہے اور اگر کوئی نصاب اپنے یہ خواص کھو بیٹھے تو اس کی اہمیت بھی ختم ہو جاتی ہے۔ برصغیر کے مدارسِ اسلامیہ میں رائج درسِ نظامی نصابِ تعلیم کا اگر تنقیدی جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ جب یہ نصاب مرتب کیا گیا تو بلاشبہ اس وقت کے رائج تمام تر نصاب ہائے تعلیم میں سے یہ وقت کے تقاضوں کے ساتھ سب سے زیادہ ہم آہنگ تھا۔ اسی وجہ سے اس نصاب کو سب سے زیادہ پزیرائی حاصل ہوئی۔ جس طرح وقت کے تبدل سے اس کے تقاضوں کی تبدیلی لازم ہے، اسی طرح نصابِ تعلیم کو بھی ان تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا انتہائی ضروری ہوتا ہے۔ درسِ نظامی کی بنیادیں سلطنتِ مغلیہ کے تقریباً زمانہ زوال میں پڑیں۔ اگر اسلامی حکومت قائم رہتی تو ممکن ہے اس نظام تعلیم میں بھی ضروریاتِ زمانہ کے پیش نظر تبدیلیاں ہوتی رہتیں، لیکن چونکہ انگریز حکومت نے اپنے پنجے مضبوط کرنے کے ساتھ ہی نظامِ تعلیم کو ہی تبدیل کر دیا، اس لئے اس نظامِ تعلیم کی بقا کی راہیں مسدود ہونا شروع ہو گئیں کیونکہ "عوام حکمرانوں کی اقتداء میں چلتے ہیں"[6]۔ اور پھر جنگِ آزادی سنہ ۱۸۵۷ء کے بعد اس نظام تعلیم کے احیاء کا مقصد تو انگریزی نظامِ تعلیم کے متوازی عصری ضروریات سے ہم آہنگ نظامِ تعلیم کا اجراء بالکل تھا ہی نہیں بلکہ اس وقت اس کا مقصد اولین اسلامی اقدار و نظریات کی حفاظت کرنا تھا۔

درس نظامی کے قدیم اور جدید (مروج) نصاب تعلیم کا فرق

ابتداء میں نصاب کا تصور بالکل نہیں تھا بلکہ اس زمانے میں کتاب پڑھنے کے بجائے فن پڑھایا جاتا تھا۔ اور اسلئے ہر فن کے ماہر عالم کے پاس اس علم کے تشنگان کی بھیڑ لگ جاتی تھی۔ بعد میں نصابِ تعلیم کا تصور ابھرا۔ قاری محمد حنیف جالندھری ناظم اعلیٰ وفاق المدارس العربیہ (ملتان) کے مطابق درس نظامی جس نصابِ تعلیم کا تسلسل ہے "اس زمانے میں جتنے علوم ہندوستان میں مروج تھے، وہ اس نصاب میں شامل تھے۔ کوشش یہ کی جاتی تھی کہ اس نصاب کا فارغ (فارغ التحصیل) کسی رائج الوقت علم سے بالکل ناواقف نہ رہے۔ اس زمانے کی سائنس، میڈیکل سائنس، انجینئرنگ، اقلیدس، الجبراء، جیومیٹری اور ریاضی اس نصاب کا حصہ تھے۔ آزاد معاش کا طریقہ اختیار کرنے میں مدد دینے کے لئے طب (میڈیکل سائنس) بھی شامل نصاب تھی۔ اسی وجہ سے اس درس کے پڑھے ہوئے بے شمار لوگ طبیب، انجینئر، منتظم اور معمار ہوا کرتے تھے۔ چنانچہ جس ماہر تعمیرات نے تاج محل تعمیر کیا تھا، یعنی استاد احمد معمار لاہوری (۱۶۴۹ء) وہ اسی درسِ نظامی کا پڑھا ہوا تھا۔ معماری کا یہ فن اس نے مدرسے سے ہی بیٹھ کر سیکھا تھا۔[7] علامہ شبلی نعمانیؒ نے مقالات میں ملا نظام الدین کے مرتب کردہ درس نظامی نصاب تعلیم کے جو خصائص لکھے ہیں وہ درج ذیل ہیں:

1۔ نصاب میں ہندوستان کے علماء کی متعدد کتابیں داخل ہیں مثلاً نورالانوار، سلم، مسلم، رشیدیہ، شمس بازغہ، حالانکہ اس سے پہلے یہاں کی ایک تصنیف بھی درس میں داخل نہ تھی۔

2۔ ہر فن کی وہ کتابیں لی ہیں جن سے زیادہ مشکل اس فن میں کوئی کتاب نہ تھی۔

3۔ منطق و فلسفہ کی کتابیں تمام علوم کی نسبت زیادہ ہیں۔

4۔ حدیث کی صرف ایک کتاب ہے یعنی مشکوٰۃ

5۔ ادب کا حصہ بہت کم ہے۔[8]

قدیم نصاب درس نظامی میں جو مضامین شامل تھے، ان میں صرف، نحو، منطق، حکمت و فلسفہ، ریاضی، بلاغت، فقہ، اصول فقہ، علم کلام، تفسیر قرآن اور حدیث شامل تھے، البتہ اس نصاب میں حدیث کی تعلیم صرف مشکوٰۃ المصابیح تک تھی۔ اس کے مقابل جب موجودہ درس نظامی نصاب تعلیم کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو ریاضی کے علاوہ باقی تمام مضامین معمولی ترمیمات کے ساتھ وہی ہیں، البتہ قدیم نصاب میں حدیث کی کتب میں صرف مشکوٰۃ المصابیح شامل تھی جب کہ موجودہ نصاب میں صحاح ستہ کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ موجودہ مدرسہ ایجوکیشن سسٹم میں درسِ نظامی سے قبل تین سالہ کورس جسے "متوسطہ" کا نام دیا گیا ہے، بھی شاملِ نصاب ہے، جس کے نصاب میں وفاق المدارس العربیہ ملتان نے اسی سال یہ ترمیم کی ہے کہ ہر صوبے کی سطح پر جماعت ہشتم کا ٹیکسٹ بک بورڈ کا جو کورس رائج ہے، اس کے ساتھ ساتھ سیرت الرسول (برائے متوسطہ سالِ سوم) اور اردو (برائے متوسطہ سالِ سوم) سے امتحان لیا جائے گا۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ درسِ نظامی کے قدیم نصابِ تعلیم میں جتنے بھی فنون شامل تھے، علاوہ ریاضی کے باقی سب میں صرف کتبِ فنون کی ترمیم کی گئی۔

درس نظامی نصاب تعلیم کی ضرورت و اہمیت

درس نظامی نصابِ تعلیم کو اپنے نفاذ کے ابتدائی دور سے لے کر آج تک بڑی اہمیت حاصل رہی ہے کیونکہ جہاں اس سے فضلاء کا دینی رُخ متعین ہوتا ہے وہاں یہ حصولِ علم کا صد فیصد مفت ذریعہ تعلیم ہے۔ ایک اہم وجہ یہ بھی ہے کہ درس نظامی مدارسِ تعلیم کو مذہبی بنیادیں حاصل ہیں اور اس کے ساتھ یہ مدارس ملک کے کونے کونے اور ہر بڑے شہر میں موجود ہیں۔ جامعہ فاروقیہ کراچی کے ایک مقالہ نگار لکھتے ہیں:

> "مدارس کے نصاب تعلیم کو نہایت ہی بنیادی و اساسی اہمیت حاصل ہے، جس سے یہاں کے فارغ التحصیل علماء کا دینی رخ متعین ہوتا ہے۔ درجات عربیہ میں بہت سارے علوم و فنون داخل ہیں، جن میں کچھ علوم عالیہ ہیں، جو مقاصد کا درجہ رکھتے ہیں اور کچھ علوم آلیہ ہیں جو علوم عالیہ کے لیے ممد و معاون یا وسائل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ علوم عالیہ قرآن و حدیث، تفسیر، اصول تفسیر،

حدیث، اصول حدیث، فقہ، اصول فقہ، علم عقائد وکلام وغیرہ۔ علوم آلیہ صرف ونحو، معانی وبیان، ادب عربی، منطق، فلسفہ وغیرہ۔ ان ہی کتابوں کو پڑھ کر بڑے بڑے مفسرین محدثین، علماء وفضلاء تیار ہوتے رہے ہیں۔"[9]

قاری محمد حنیف جالندھری درس نظامی کی خدمات اور ضرورت واہمیت کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"برصغیر میں اسلامی علوم وروایات کے تحفظ اور معاشرہ میں دینی حمیت کو زندہ رکھنے کے لئے مدارسِ دینیہ نے جو کردار ادا کیا ہے، اس کا اعتراف نہ کرنا بے انصافی ہے۔ دینی مدارس نے علم کی روشنی پھیلانے، جہالت کی تاریکی دور کرنے، ملک میں ناخواندگی کی شرح کم کرنے، شرح خواندگی بڑھانے، اسلامی تعلیمات، معلومات اور روایات کو اجاگر کرنے کی اہم ذمہ داری کو باحسن وجوہ پورا کیا ہے۔ قوم کو عالمِ دین، فقیہ، مفتی، قاضی، محدث، مفسر، حافظ، مفکر، مبلغ، مصنف اور مصلح دیئے۔ نادار اور بے سہارا بچوں اور بچیوں کی تعلیم وتربیت کی ذمہ داری قبول کر کے نہ صرف ان کی کفالت کی بلکہ ان کو زیورِ تعلیم سے آراستہ وفیض یاب کیا۔۔۔ یہ مدارس اسلام اور علومِ دینیہ کے ایسے قلعے ہیں جن کی وجہ سے آج تک دین محفوظ چلا آرہا ہے۔ دینی تعلیم کی اہمیت وضرورت اس لحاظ سے بھی ہے کہ جب بھی انسان علمِ دین اور حکمت کی دولت سے تہی دامن ہوا تو مذموم خصائل کا حامل بنا اور حق تعالیٰ شانہ اور مخلوق کے حقوق سے بے خبر وبے فکر ہو کر حرص، لالچ، طمع، قتل وقتال، باہمی عداوت اور ظلم وستم جیسے جذباتِ فاسدہ کا شکار ہوا۔ یہ مدارس انسانیت کو اخلاقی پستی سے نکال کر عمدہ اخلاق سے آراستہ کرنے، دنیا میں امن وامان، ایثار وقربانی اور نجاتِ اخروی کا بہت بڑا ذریعہ ہیں۔[10]

درج بالا اقتباسات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ درس نظامی نصابِ تعلیم اپنی اندر دینی حمیت اور اسلامی تہذیبی بصارت رکھتا ہے، جس کی وجہ سے اس کو ایک مسلمہ اہمیت حاصل ہے اور اس کی ضرورت کی بڑی وجہ بھی یہی ہے۔ یہ مدارس جہاں رجال سازی کے کارخانے ہیں، وہیں اسلامی تہذیب وثقافت کے امین بھی ہیں اور مطلق العنان مغربی تہذیب کے سامنے سیسہ پلائی ہوئی دیوار بھی ہیں۔ یہ وہی مدارسِ اسلامیہ ہیں، جن سے متعلق علامہ محمد اقبالؒ نے فرمایا تھا کہ "ان مکتبوں کو اسی حالت میں رہنے دو، غریب مسلمانوں کے بچوں کو انہی مکتبوں میں پڑھنے دو، اگر یہ ملا اور درویش نہ رہے تو جانتے ہو کیا ہو گا۔ جو کچھ ہو گا، میں اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ آیا ہوں۔ اگر ہندوستان کے مسلمان اِن مکتبوں کے اثر سے محروم ہو گئے تو بالکل اسی طرح جس طرح ہسپانیہ میں مسلمانوں کی آٹھ سو برس کی حکومت کے باوجود آج غرناطہ اور قرطبہ کے کھنڈر اور الحمرا اور باب الاخوتین کے (نشانات کے) سوا اسلام کے پیروؤں اور اسلامی تہذیب کے

آثار کا کوئی نقش نہیں ملتا، ہندوستان میں بھی آگرے کے تاج محل اور دِلی کے لال قلعے کے سوا مسلمانوں کی آٹھ سو برس کی حکومت اور ان کی تہذیب کا کوئی نشان نہیں ملے گا۔"[11]

قطع نظر اس بات سے کہ مدارس کے نصابِ تعلیم میں تبدیلی سے متعلق علامہ اقبالؒ کے نظریات کیا تھے، اس اقتباس سے مدارسِ اسلامیہ کی ضرورت واہمیت کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔

درس نظامی نصاب تعلیم میں تبدیلی کے نظریات کا جائزہ (مفکرین برصغیر کی آراء کے تناظر میں)

دورِ حاضر میں مدارس درسِ نظامیہ پر جو تنقیدات کی جاتی ہیں، ان سب کا نچوڑ یہ ہے کہ مدارس اسلامیہ جامد قسم کے مُلا پیدا کرنے کا سبب ہیں، جو معصریت کے تقاضوں سے نا آشنا ہیں۔ انہی جامد ملاؤں کی وجہ سے قدامت پرستی میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اس لئے اس قدامت پرستی کو روکنے اور عصری معنویت سے ہم آہنگ نتائج کے حصول کے لئے مدارس کے نصابِ تعلیم پر نظر ثانی اور اس میں ترمیم ناگزیر ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ جہاں درسِ نظامی پر تنقیدات کا ایک وسیع ذخیرہ موجود ہے وہاں اس کے حمایتی ادب کی وسعت تنقیدی لٹریچر سے بھی کہیں زیادہ ہے۔ لیکن اگر مفکرین ہند کی آراء کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ وہ اس نصابِ تعلیم کی اہمیت، غرض وغایت اور ضرورت سے پوری طرح آگاہ تھے، اس لئے انہوں تنقید سے بالاتر ہو کر اصلاح کی کوششیں کیں۔ بالفاظِ دیگر ان کی تنقید برائے تعمیر تھی نہ کہ برائے تخریب۔ کسی نے تو اس نصابِ تعلیم میں ضروریاتِ حاضرہ کے پیشِ نظر اصلاح کی غرض سے مکمل نظامِ تعلیم دے دیا تو کسی نے ترمیم واضافے کو مناسب سمجھتے ہوئے اس سلسلہ میں صرف اپنی رائے کا اظہار کیا، جیسا کہ شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ یہ سمجھتے تھے کہ نظام تعلیم کی دوئی برصغیر کی مسلم قوم کے درمیان خلیج کی سب سے بڑی وجہ ہے، اس لئے انہوں نے یہ وضاحت ضروری سمجھی:

> "اے نونہالانِ وطن! جب میں نے دیکھا کہ میرے اس درد کے غم خوار جس میں میری ہڈیاں پگھلی جارہی ہیں، مدرسوں اور خانقاہوں میں کم اور اسکولوں اور کالجوں میں زیادہ ہیں تو میں نے اور میرے چند احباب نے ایک قدم علی گڑھ کی طرف بڑھایا اور اس طرح ہم نے ہندوستان کے دو تاریخی مقاموں دیوبند اور علی گڑھ کا رشتہ جوڑا۔" اسی خطبۂ صدارت میں آپ نے فرمایا: "آپ میں جو حضرات محقق اور باخبر ہیں وہ جانتے ہوں گے کہ میرے بزرگوں نے کسی بھی وقت کسی اجنبی زبان سیکھنے یا دوسری قوموں کے علوم وفنون حاصل کرنے پر کفر کا فتویٰ نہیں دیا! ہاں بے شک یہ کہا کہ انگریزی تعلیم کا آخری اثر یہی ہے جو عموماً دیکھا گیا کہ لوگ نصرانیت (مغربیت) کے رنگ میں رنگ جاتے ہیں یا ملحدانہ گستاخیوں سے اپنے مذہب یا مذہب والوں کا مذاق اڑاتے یا حکومتِ وقت کی پرستش کرنے لگتے ہیں۔"[12]

چونکہ شیخ الہندؒ کی پوری زندگی انقلابی تحریکوں کی نذر ہو گئی، اس لئے وہ کوئی پورا نصابِ تعلیم تو مرتب نہ کر سکے لیکن واقفانِ حال کے مطابق وہ ایک ایسے نصابِ تعلیم کے خواہش مند تھے، جو اسلامی علوم کے ساتھ ساتھ معصریت کے تقاضوں کو بھی پورا کرتا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کا مرتب کردہ نصابِ تعلیم ان ہی کی فکر کا عکاس معلوم ہوتا ہے۔ جیسا کہ علامہ زاہد الراشدی صاحب شیخ الہند کے تعلیمی نظریات کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

> "تعلیم کے قدیم اور جدید نظاموں کو ملانے کی ضرورت ہے اور قرآن کریم کو عوام میں زیادہ سے زیادہ پھیلانے کی ضرورت ہے۔ انہوں نے نہ صرف سیاسی اور تحریکی میدان میں قدیم اور جدید میں رابطے پیدا کیے بلکہ تعلیمی محاذ پر خود علی گڑھ تشریف لے جا کر جدید تعلیم یافتہ حضرات کے ساتھ تعلقات و روابط کا آغاز کیا۔ ان کی اس فکر پر "نیشنل مسلم یونیورسٹی" قائم ہوئی جو بعد میں جامعہ ملیہ کی شکل اختیار کر گئی۔۔۔ میں تاریخ کے ایک طالب علم کی حیثیت سے حضرت مدنی کی اسی تحریر کو حضرت شیخ الہندؒ کے تعلیمی ذوق و اسلوب اور فکر و فلسفہ کے تعارف کا سب سے بہترین ذریعہ تصور کرتا ہوں۔"[13]

علامہ شبلی نعمانیؒ بھی درسِ نظامی نصابِ تعلیم کے بارے میں یہی رائے رکھتے تھے کہ اسے عصرِ حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ کیا جائے، جیسا کہ وہ اپنے نقطہ نظر کو ان الفاظ میں لکھتے ہیں:

> "موجودہ درس جو نظامیہ کے نام سے مشہور ہے، دراصل درس نظامیہ نہیں ہے، اس میں بہت سی کتابیں ایسی اضافہ ہو گئیں جو ملا نظام الدین صاحب کے عہد میں موجود بھی نہ تھیں مثلاً ملا حسن، حمد اللہ، حاشیہ غلام یحیٰ، قاضی مبارک۔ اگرچہ ہمارے نزدیک ضروریاتِ زمانہ کے لحاظ سے درس نظامیہ میں بہت کچھ ترمیم و اضافہ کی ضرورت ہے لیکن اس مضمون میں ہم اس بحث کو نہیں چھیڑتے"[14]

علامہ شبلی نعمانیؒ کے اقتباس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ درسِ نظامی میں ان کے دور تک بھی کئی ایک تبدیلیاں کی جا چکی تھیں۔ نصابِ مدارس کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی خاطر جن مفکرین نے خدمات سرانجام دیں، ان کی تفصیل درج ذیل ہے۔

سر سید احمد خان

سر سید احمد خان[15] برصغیر پاک و ہند کی ایک نابغہ روزگار شخصیت ہونے کے باوجود ہمیشہ سے متنازعہ رہی ہے۔ قطع نظر اس بحث سے کہ سر سید احمد خان کے اسلامی مسلمات کے بارے میں تفرداتی نظریات کیا تھے، انہوں نے برصغیر

پاک وہند کے مسلمانوں کے لئے ایک منظم نظام تعلیم پیش کیا۔ ایم اے او کالج / علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا قیام اسی سلسلے کی کڑیاں تھیں۔ سرسید احمد خان جامد تقلید اور قدامت پرستی کے مخالف تھے، اس کے ساتھ ساتھ وہ مشرقی طرزِ تعلیم جو مدارس کی شکل میں جاری تھا کو بھی عصری معنویت کا حل نہیں سمجھتے تھے، یہی وجہ ہے کہ وہ اس کے بہت بڑے ناقد بھی تھے اور اس حوالے سے ان کا لہجہ بھی ترش ہوتا تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

"ہم اپنے ہاں کے عالموں کا حال بالکل ہی دیکھتے ہیں: کہ ان کے روحانی قویٰ بالکل نیست ونابود ہو جاتے ہیں، اور صرف زبانی بک بک یا تکبر وغرور، اور اپنے کو بے مثل ونظیر، قابلِ ادب سمجھنے کے اور کچھ باقی نہیں رہتا، زندہ ہوتے ہیں مگر دلی اور روحانی قویٰ کی شگفتگی کے اعتبار سے بالکل مردار ہوتے ہیں۔۔۔ اور ہماری حالت تمام معاملات میں، کیا دین کے کیا دنیا کے، خراب ہوئی چلی جاتی ہے۔"[16]

لیکن اگر دیکھا جائے تو مدارس کے بالمقابل چلنے والے جامعات کے نظام سے بھی وہ کلی مطمئن نہیں تھے بلکہ ہندوستان کی جامعات کی بی اے اور ایم اے کی ڈگریوں کو متوسط تعلیم گردانتے تھے لیکن جب جامعات کی بات ہوتی تو ان کے لہجے میں درشتی کی بجائے اصلاح کا پہلو ہوتا، جیسا کہ وہ لکھتے ہیں:

"اعلیٰ تعلیم دینے والی وہ یونیورسٹیاں جو ہندوستان میں موجود ہیں۔ وہ بلاشبہ بی اے اور ایم اے کی ڈگریاں دیتی ہیں۔ مگر اس تعلیم کو اعلیٰ تعلیم کہنا ہمارے نزدیک محض ناواجب ہے؛ بلکہ وہ علم کی بعض شاخوں میں اوسط درجہ کی تعلیم ہے اور بعض شاخوں میں ادنیٰ درجہ کی تعلیم کا رتبہ رکھتی ہے۔"[17] اسی طرح وہ جدت اور سائنسی طرز تعلیم کو فوقیت دیتے تھے، جیسا کہ وہ لکھتے ہیں کہ "سائنسز بلاشبہ نہایت عمدہ چیزیں ہیں؛ اور سائنسز کا جاننے والا آج کل کے زمانہ میں قریب قریب ہر حرفت پر پورا اختیار اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے، اور معاش حاصل کرنے کے لئے ایک نہایت عمدہ طریقہ اس کے پاس ہوتا ہے، جیسا کہ یورپ کے مشہور ملکوں میں دیکھا جاتا ہے۔"[18]

سرسید احمد خان کے تعلیمی نظریات کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہ مدرسہ ایجوکیشن سسٹم کے طرز تعلیم سے مکمل طور پر بغاوت کی راہ اختیار کر چکے تھے اور انہیں مسلمانوں کی فلاح صرف اور صرف مغربی تعلیمی نظام میں نظر آرہی تھی۔ جیسا کہ ضیاء الدین لاہوری سرسید احمد خان کے تعلیمی نظریات کو یوں تحریر کرتے ہیں:

"جو شخص اپنی قومی ہمدردی سے اور دور اندیش عقل سے غور کرے گا وہ جانے گا کہ ہندوستان کی ترقی کیا علمی اور کیا اخلاقی صرف مغربی علوم میں اعلیٰ ترقی حاصل کرنے پر منحصر ہے۔ اگر ہم اپنی اصلی ترقی چاہتے ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنی مادری زبان تک کو بھول جائیں، تمام مشرقی علوم

کو نسیاً منسیاً کر دیں، ہماری زبان یورپ کی اعلیٰ زبانوں میں سے انگلش یا فرنچ ہو جائے، یورپ ہی کے ترقی یافتہ علوم دن رات ہمارے دست مال ہوں، ہمارے دماغ یورپین خیالات سے (بجز مذہب کے) لبریز ہوں"[19]۔

پھر اسی کتاب کے صفحہ ۲۰۷ سے ۲۱۰ تک مدارس کے نظامِ تعلیم پر خوب تنقید بھی کی ہے۔ سرسید کے نظریاتِ تعلیم کو مختصراً یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ وہ چاہتے تھے کہ مسلمان نہ صرف علومِ عصریہ (سائنس و ٹیکنالوجی) میں مہارت حاصل کریں بلکہ قدیم علوم و فنون جو وقتی تقاضوں کو پورا کرنے سے قاصر ہیں، انہیں بھی یکسر چھوڑ دیا جائے۔ ابتدائی طور پر وہ مادری زبان میں جدید تعلیم بذریعہ تراجم کے خواہش مند تھے لیکن بعد میں ان کا یہ نظریہ بھی تبدیل ہو گیا اور یورپی زبانوں کو اعلیٰ کے حصول کا ذریعہ سمجھنے لگے۔

مولانا حسین احمد مدنی[20]

آپؒ کا تعلق فیض یافتگانِ شیخ الہند سے ہے۔ آپؒ نے جو نصابِ تعلیم مرتب کیا، اسے مدنی نصاب تعلیم کے نام سے شہرت حاصل ہے، جسکی نمایاں جزئیات درج ذیل ہیں:

1۔ یہ سولہ سالہ نصابِ تعلیم ہے جو تین حصوں مکتب، مدرسہ ثانویہ اور مدرسہ عالیہ میں تقسیم کیا گیا ہے۔

مکتب: یہ ابتدائی داخلہ سے تین سال تک کا تعلیمی دورانیہ ہے، جس میں داخلہ کی عمر پانچ سے سات سال رکھی گئی ہے۔ اس تین سالہ دورانیہ میں ابتدائی ضروری مذہبی تعلیم، ابتدائی حساب کتاب اور صوبائی جغرافیائی تعلیم شامل ہے۔

مدرسہ ثانویہ: یہ سکولنگ کا اگلا درجہ ہے، جس کا دورانیہ پانچ سال ہے۔ مکتب پاس طلباء اس درجہ میں داخلہ کی اہلیت رکھتے ہیں۔ اس درجہ میں مذہبی تعلیم کے ساتھ ساتھ عصری علوم کی ضروری کتب کو بھی بطور نصاب دخل حاصل ہے۔ اس کے ساتھ پانچ زبانوں کو لازمی قرار دیا گیا ہے جن میں صوبائی زبان بغرض درسی زبان، عربی بطور مذہبی زبان، اردو بطور مسلم شناختی و برصغیر کی علمی زبان، انگریزی بطور عالمی زبان اور فارسی برائے علمی استفادہ شامل ہیں۔ دیگر جن زبانوں میں تخصص کرنا شامل ہے، ان میں سنسکرت، برہمی، سیامی اور تامل کھاسیا اوڑیا زبانیں شامل ہیں۔

مدرسہ عالیہ: تدریس کے اس درجے میں مدرسہ ثانویہ کا امتحان پاس کرنے والے طلباء داخلہ کے اہل ہیں۔ اس سطح تعلیم کا دورانیہ آٹھ سال پر مشتمل ہے اور اس کا غالب عنصر فنونِ عربیہ و علوم دینیہ کو رکھا گیا ہے۔

2۔ حالاتِ حاضرہ سے آگاہی اور ان کے مطالعہ کو وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ رکھنے کے لئے اخبار بینی کو بطور نصاب دخل حاصل ہے اور اس مقصد کے لئے علیحدہ طور پر وقت کا تعین کر دیا گیا ہے۔ طلبہ میں صحافیانہ

استعداد پیدا کرنے کی غرض سے اس نصاب کے حامل ہر مدرسہ کے لئے دارالمطالعہ کا قیام اور دیگر راہنمائی بھی فراہم کر دی گئی ہے۔

3۔اس نصاب تعلیم میں ذرائع معاش کو انتہائی اہمیت دی گئی ہے اور اس مقصد کے لئے طالب علم کا کسی ایک دستکاری کو سیکھنا لازمی ہے۔ جبکہ کوئی بھی طالب علم اپنے ذوق کے مطابق زیادہ دستکاریاں بھی سیکھ سکتا ہے۔ جن دستکاریوں کو بطور نصاب شام کیا گیا ہے، ان میں چرخہ چلانا، کپڑا بننا، حدادی (لوہے کا کام)، نجاری (بڑھئی کا کام)، خیاطت (کپڑا سینا)، گھڑی سازی، جلد بندی، چمڑہ رنگنا، بوٹ وغیرہ بنانا اور جیولری شامل ہیں۔

4۔جسمانی تعلیم جسے موجودہ اصطلاح میں فزیکل ایجوکیشن کہا جاتا ہے، اس نصاب تعلیم کا جزو لازم ہے۔ جس کی عملی مشق کے لئے عصر کا وقت مختص کیا گیا ہے۔

5۔اس نصاب تعلیم میں سابقہ مروج نصاب کے اندر جن علوم کا اضافہ کیا گیا ان میں میڈیکل (طب)، ریاضی اور جیومیٹری، پولیٹیکل سائنس، نقشہ نویسی، جغرافیہ، سائنسِ جدید، معاشیات و اقتصادیات اور فلسفہ قدیم و جدید شامل ہیں۔ مدرسہ ثانویہ کے طلبہ کے لئے ترجمہ سازی کی تربیت اور تخصصات کے سال ثامن میں دستور انگلستان کا مطالعہ شامل کیا گیا۔

6۔مقامی زبان کو درسی زبان کا درجہ دیا گیا تاکہ Concept Based Learning ہو۔

7۔ہر تین سال بعد نصاب کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی خاطر مضامین میں حسبِ ضرورت تبدیلی کا آپشن رکھا گیا۔

8۔چھوٹے بچوں کے لئے جسمانی سزا کی مکمل ممانعت اور سمجھدار کے لئے صرف تادیب کی حد تک اجازت دی گئی۔

9۔ہر جماعت کے طلبہ کے لئے علیحدہ تعارفی یونیفارم اور اساتذہ کے لئے کھدر کے عمامہ و جبہ کا لازمی استعمال بغرض پہچان و تعارف

10۔مکتب کے بچوں کا روزانہ کا دورانیہ تعلیم چار گھنٹے جبکہ ثانوی کے طلباء کا روزانہ کا تعلیمی دورانیہ چھ گھنٹے رکھا گیا۔[21]

سید حسین احمد مدنیؒ کے نصابِ تعلیم کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ آپؒ مدارس کے نصابِ تعلیم کو عصر حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا چاہتے تھے۔ جو نصابِ تعلیم آپ نے مرتب کیا اس میں مذہبی تعلیم کے ساتھ ساتھ عصری ضروریات کو بھی مد نظر رکھا گیا۔ اس نصاب تعلیم میں مدارسِ اسلامیہ میں وسعت پیدا کرنے کا نظریہ پیش کیا گیا تھا جہاں مذہبی تعلیم کے ساتھ ساتھ فزیکل ایجوکیشن، میڈیکل سائنسز، ٹیکنیکل تعلیم، معاشیات و اقتصادیات،

پولیٹیکل سائنس، قانون کی تعلیم، جغرافیہ، جرنلزم، مختلف زبانوں و دیگر مضامین کو شامل کرنے کی طرف راہنمائی کی گئی۔ اس نصابِ تعلیم میں مزید وسعت یا تجرباتی بنیادوں پر نصابِ تعلیم میں تبدیلی کی لچک بھی رکھی گئی۔

ابو الاعلیٰ مودودی

سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ[22] کا شمار بھی ثنویت نصاباتِ تعلیمات کے مخالف مفکرینِ ہند میں ہوتا ہے۔ آپؒ کے مطابق تہذیب اسلامی کے زوال کا اصلی سبب دو طبقات ہیں۔ اول جدید تعلیم یافتہ طبقہ جن کا شمار تو مسلمانوں میں ہوتا ہے لیکن ان کی تعلیم مغربی نصابِ تعلیم کے زیرِ اثر رہی، دوم ایسے عالم جن کی وجہ سے دنیوی علم و عمل سے علمِ دین کا رابطہ ٹوٹ گیا ہے۔ وہ جتنے مغربی تعلیمی اثرات سے بیزار نظر آتے ہیں، اتنے ہی بیزار جامد قسم کے ملاؤں سے ہیں۔ علامہ مودودی نے علی گڑھ کے نصاب تعلیم میں علوم دینیات پر ترمیم و نظر ثانی کی غرض سے جو تبصرہ کیا ہے، وہ کچھ یوں ہے:

> "اگر آپ چاہتے ہیں کہ اسلامی کلچر پھر سے جوان ہو جائے اور زمانہ کے پیچھے چلنے کی بجائے آگے چلنے لگے تو اس ٹوٹے ہوئے ربط کو پھر قائم کیجئے، مگر اس کو قائم کرنے کی صورت یہ نہیں ہے کہ دینیات کے نصاب کو جسمِ تعلیمی کی گردن کا قلادہ یا کمر کا پشتارہ بنا دیا جائے۔ نہیں اس کو پورے نظامِ تعلیم میں اس طرح اتار دیجئے کہ وہ اس کا دورانِ خون، اس کی روح رواں، اس کی بینائی و سماعت، اس کا احساس و ادراک، اس کا شعور و فکر بن جائے اور مغربی علوم و فنون کے تمام اجزاء کو اپنے اندر جذب کر کے اپنی تہذیب کا جزو بناتا چلا جائے۔ اس طرح آپ مسلمان فلسفی، مسلمان سائنسدان، مسلمان ماہرین معاشیات، مسلمان مقننن، مسلمان مدبرین، غرض تمام علوم و فنون کے مسلمان ماہر پیدا کر سکیں گے، جو زندگی کے مسائل کو اسلامی نقطہ نظر سے حل کرینگے۔ تہذیب حاضر کے ترقی یافتہ اسباب و وسائل سے تہذیبِ اسلامی کی خدمت لیں گے اور اسلام کے افکار و نظریات اور قوانینِ حیات کو روحِ عصری کے لحاظ سے از سر نو مرتب کریں گے۔"[23]

آگے لکھتے ہیں:

> "علوم و دینی و دنیاوی دو الگ الگ قسموں میں منقسم کرنا دراصل دین اور دنیا کی علیحدگی کے تصور پر مبنی ہے اور یہ تصور بنیادی طور پر غیر اسلامی ہے"[24] آپؒ سکولز ایجوکیشن سسٹم کے متعلق لکھتے ہیں کہ "ان درس گاہوں میں آپ کو فلسفہ، سائنس، معاشیات، قانون، سیاسیات، تاریخ، اور دوسرے وہ تمام مضامین پڑھائے جاتے ہیں جن کی مارکیٹ میں مانگ ہے۔ مگر آپ کو اسلام کے فلسفے، اسلام کی اساس حکمت، اسلام کے اصول قوانین، اسلام کا نظریہ سیاسی اور فلسفہ تاریخ کی

ہوا تک نہیں لگنے دی جاتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آپ کے ذہن میں زندگی کا پورا نقشہ اپنے تمام جزئیات اور تمام پہلوؤں کے ساتھ غیر اسلامی خطوط پر بنتا ہے۔"[25]

درج بالا اقتباسات سے یہ بات مکمل طور پر واضح ہو جاتی ہے کہ علامہ مودودی ایسا نصابِ تعلیم چاہتے تھے جو اول اسلامی روح کے رسوخ کا ذریعہ ہو، تاکہ علوم عصریہ کے باطل رجحانات سے اثر پکڑنے کی بجائے ان کا اسلامی نقطہ نظر سے مطالعہ کر سکے۔ دوم ایسا نصاب جامدیت سے بالاتر ہو، تاکہ نئے افکار و نظریات کی پیدائش کا سبب بنے، جس سے نسلِ نو کی جدید تقاضوں کے مطابق مکمل راہنمائی ہو سکے۔ علامہ صاحب نصابِ تعلیم میں کسی بھی ایسے طرز تعلم کی مخالفت کرتے ہیں جن میں مذہبی تعلیمات اور علوم عصریہ جدیدہ کو ایک دوسرے سے یکسر جدا کر دیا جائے کیونکہ وہ اس طرز کو اسلامی طرقِ تدریس سے متصادم سمجھتے ہوئے مسیحی تعلیمی تصور سے تشبیہ دیتے ہیں۔ انہی نظریات کے پیش نظر انہوں نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے نصابِ تعلیم میں تبدیلی کے جو نکات پیش کئے ہیں، وہ کچھ یوں ہیں:

1۔ سب سے پہلے مغربی علوم و فنون پر نظر ثانی کی جائے، ان علوم کو جوں کا توں لینا درست نہیں۔

2۔ تمام مغربی علوم کو طلبہ کے سامنے تنقید کے ساتھ پیش کیا جائے اور یہ تنقید خالصتاً اسلامی نقطہ نظر سے ہو۔ (تاکہ مسلمان طلبہ پر مغربی اثرات کو زائل کیا جا سکے اور تنقیدی مطالعات میں ان کی روح کو جِلا بخشی جا سکے)

3۔ علومِ اسلامیہ کو بھی قدیم کتابوں سے جوں کا توں نہ لیا جائے بلکہ ان میں سے متاخرین کی آمیزش کو الگ کر کے اسلام کے دائمی اصول اور حقیقی اعتقادات اور غیر متبدل قوانین کو لیجئے۔

4۔ قرآن و سنت کی تعلیم سب سے مقدم ہو مگر تفسیر و حدیث کے پرانے ذخیروں سے نہیں، ان کے پڑھانے والے ایسے ہوں جو قرآن و سنت کے مغز کو پا چکے ہوں۔ (اس کا مقصد اسلامی معاشرے پر طاری جمود کو توڑنا اور اسلامی علوم کی سائنس و عصری علوم کی جانب نئی تعبیرات کو اجاگر کرنا ہے۔)

5۔ اسلامی قانون کی تعلیم بھی ضروری ہے، مگر یہاں بھی پرانی کتابیں کام نہ دیں گی۔ آپ کو معاشیات کی تعلیم میں اسلامی نظمِ معیشت کے اصولِ قانون کے مبادی، فلسفہ کی تعلیم میں حکمتِ اسلامیہ کے نظریات، تاریخ کی تعلیم میں اسلامی فلسفہ تاریخ کے حقائق اور اس طرح ہر علم و فن کی تعلیم میں اسلامی عنصر کو ایک غالب اور حکمران عنصر کی حیثیت سے داخل کرنا ہو گا۔

6۔ تعلیمی اداروں سے ملاحدہ کو علیحدہ کرنا ہو گا اور فکر و نظر کے اعتبار سے مسلمان جو علومِ جدیدہ میں بصیرت رکھتے ہوں، انہیں اپنے اداروں میں لانا ہو گا۔[26]

مولانا مودودی صاحب نے ہائی سکول کے طلبہ کے لئے جو نصاب تعلیم رائج کرنے کی تجویز پیش کی ہے، وہ کچھ یوں ہے:

(الف) عقائد: اس مضمون میں عقائد کی خشک کلامی تفصیلات نہ ہونی چاہئیں بلکہ ایمانیات کو ذہن نشین کرنے کے لئے نہایت لطیف انداز بیان اختیار کرنا چاہیئے جو فطری وجدان اور عقل کو اپیل کرنے والا ہو۔ طلبہ کو یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ اسلام کے ایمانیات دراصل کائنات کی بنیادی صداقتیں ہیں اور یہ صداقتیں ہماری زندگی سے گہرا ربط رکھتی ہیں۔

(ب) اسلامی اخلاق: اس مضمون میں مجرد اخلاقی تصورات نہ پیش کئے جائیں بلکہ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام اور انبیاء علیہم السلام کی سیرتوں سے ایسے واقعات لے کر جمع کئے جائیں جن سے طلبہ کو معلوم ہو کہ ایک مسلمان کے کریکٹر کی خصوصیات کیا ہیں اور مسلمان کی زندگی کیسی ہوتی ہے؟

(ج) احکام فقہ: اس مضمون میں حقوق اللہ اور حقوق العباد اور شخصی کردار کے متعلق اسلامی قانون کے ابتدائی اور ضروری احکام بیان کئے جائیں۔ جن سے واقف ہونا ہر مسلمان کے لئے ناگزیر ہے۔۔۔ احکام اور عبادات کی معنویت ان کی روح اور ان کے مصالح، طلبہ کے ذہن نشین کرنے چاہئیں۔ ان کو یہ بتانا چاہیئے کہ اسلام تمہارے لئے انفرادی اور اجتماعی زندگی کا کیا پروگرام بناتا ہے اور یہ پروگرام کس طرح ایک صالح سوسائٹی کی تخلیق کرتا ہے۔

(د) اسلامی تاریخ: یہ مضمون صرف سیرتِ رسول اور دورِ صحابہؓ تک محدود رہے۔ اس کے پڑھانے کی غرض یہ ہونی چاہیئے کہ طلباء اپنے مذہب اور اپنی قومیت کے اصل سے واقف ہو جائیں اور ان کے دلوں میں اسلامی حمیت کا صحیح احساس پیدا ہو۔

(ہ) عربیت: عربی زبان کا محض ابتدائی علم جو ادب سے ایک حد تک مناسبت پیدا کر دے۔

(و) قرآن: صرف اتنی استعداد کی لڑکے صرف کتاب اللہ کو روانی کے ساتھ پڑھ سکیں۔ سادہ آیتوں کو کسی حد تک سمجھ سکیں اور چند سورتیں بھی ان کو یاد ہوں۔

کالج کی تعلیم: مولانا مودودی کے مطابق اس سطح پر ایک نصاب عام ہونا چاہیئے جو تمام طلبہ کو پڑھایا جائے، جس میں عربی ادب کی متوسط تعلیم ہو اور قرآن مجید کے حوالے سے طلبہ کو قرآن کے بنیادی مقدمات ذہن نشین کرانے چاہئیں۔ بی اے کی سطح پر عربیت اور قرآن مجید کے مضامین کو یکجا کر دیا جائے۔ پھر نصابِ عام کے بعد علومِ اسلامیہ کو تقسیم کر کے مختلف علوم و فنون کی اختصاصی تعلیم میں پھیلا دیجئے اور ہر فن میں اسی فن کی مناسبت سے اسلام کی تعلیمات کو پیوست کیجئے۔[27]

مولانا مودودی مدارس کے نصاب میں جن دیگر شعبہ جات کے قیام اور تعلیم کے خواہاں تھے، ان میں (1) فلسفہ اور علوم عقلیہ کا شعبہ (2) شعبہ تاریخ (3) شعبہ علوم عمرانیہ (4) سائنسی علوم کے شعبہ جات اور وہ چاہتے تھے کہ عام نصاب پڑھنے کے بعد جب ہر طالب مذہبی علوم و نظریات میں اتنا رسوخ حاصل کر لے کہ اس کے بھٹکنے کا اندیشہ ختم ہو

جائے تو پھر مختلف طلبہ کو علیحدہ علیحدہ شعبہ جات میں تخصصات کرائے جائیں اور ہر طالب علم اپنے فَن میں ڈاکٹریٹ کے درجہ کی تعلیم رکھتا ہو۔

مولانا مناظر احسن گیلانی

سید مناظر احسن گیلانیؒ[28] کے تعلیمی نظریات کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ آپؒ بھی دو علیحدہ علیحدہ نظام ہائے تعلیم کے مخالف تھے یہی وجہ ہے کہ آپ نے اپنی تصنیف کا نام بھی "نظریہ وحدت نظام تعلیم" رکھا۔ آپؒ کے مطابق درسِ نظامی کے بارے میں جو لوگوں نے یہ رائے قائم کی ہوئی ہے کہ یہ صرف مسلمانوں کا دینی تعلیم کا نظام تھا۔ یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ درحقیقت اس نصاب تعلیم میں اس عہد کی دفتری زبان فارسی کی نظم و نثر اور انشاء وغیرہ کی بیسیوں کتابوں کے ساتھ ساتھ حساب اور خطاطی وغیرہ کی مشق کرانے کے بعد اعلی تعلیم عربی زبان کی کتابوں کے ذریعے دی جاتی تھی اس تعلیمی نصاب کی مکمل مدت ابتداء سے آخر تک پندرہ سولہ سال سے کم نہ تھی اور اس پوری مدت تعلیم میں درس نظامیہ سے فارغ ہونے والے علماء صحیح معنوں میں خالص دینیات کی کل تین کتابیں پڑھا کرتے تھے۔ قرآن کے متعلق جلالین (جو عربی زبان میں قرآن کا ترجمہ اور مختصر حل ہے۔ حدیث کے متعلق مشکوٰۃ، فقہ کے سلسلے میں دو کتابوں کو لیا جاتا تھا یعنی شرح وقایہ اور ہدایہ۔ لہذا مسلمانان ہند کوئی بھی ایسا نظام تعلیم قبول نہیں کر سکتے جو انہیں ان کے دین اسلام سے دور کر دے۔ یہی وجہ تھی کہ خاکسار نے مسلمانان ہند کے لیے جو تعلیمی نظام تجویز کیا اسے "نظامیہ وحدت نظام تعلیم" کا نام دیا جس میں انہوں نے دینی اور دنیاوی تعلیم کو یکجا کر دیا۔ اور تجویز پیش کرتے ہیں کہ حکومت مسلطہ سے درخواست کی جائے کہ جیسے پہلے دین کا عنصر ہر زمانہ میں ایک لازمی اور ضروری مضمون کی حیثیت رکھتا تھا اب بھی وہ اپنے متعین کردہ نظام تعلیم کے نصاب میں اس دین اسلام کے عنصر کو لازم کر دیں اور طلبہ ان سکولوں اور کالجوں سے ایسے دین کا علم لے کر نکلے جیسا کہ درس نظامیہ سے فارغ ہونے والے طلبہ دین کا علم اپنے پاس رکھتے تھے۔ اسی طرح بی۔ اے کی تعلیم سے فارغ ہونے والے طلبہ بھی ان کالجوں سے مذہب کے عالم بن کر نکلے۔ اس طرح جب سکولوں اور کالجوں میں انگریزی تعلیم اور عصر جدید کے مقبول علوم کے ساتھ دین اسلام کی بھی مکمل تعلیم دی جائے گی تو ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں پھر دینیات کے مدارس کے نام سے الگ عام مدرسوں کے قائم کرنے کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔ پھر ہر عالم اس وقت گریجویٹ ہو گا اور ہر گریجویٹ شخص عالم بھی ہو گا۔ ملا ہی مسٹر ہوں گے اور مسٹر ہی ملا، عالم و تعلیم یافتہ کی تفریق کا قصہ ختم ہو جائے گا۔[29]

مولانا گیلانی کے تعلیمی نظریات کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ ایک ایسا نظامِ تعلیم چاہتے تھے جو معصریت کے تقاضوں سے بھی ہم آہنگ ہو اور اس سے علومِ اسلامیہ پر بھی کوئی آنچ نہ پڑتی ہو، چہ جائیکہ وہ سکولوں، کالجوں یا جامعات میں پڑھایا

جائے یا پھر مدارسِ اسلامیہ کو اس طرز پر ڈھال لیا جائے کہ ان میں علومِ عصریہ کو رواج مل سکے۔ نظامِ تعلیم کے حوالے سے آپؒ کی تجاویز درج ذیل تھیں:

1۔ تعلیم کی مدت اگر وہی رکھی جائے جو اس وقت یونیورسٹیوں میں مقرر ہے تو میٹرک تک عربی کے اس سلسلہ کو اس طریقہ سے پہنچنا چاہیئے کہ میٹرک پاس کرنے والے معنی اور مختصر مطلب کے ساتھ قرآن ختم کر لیں اور انٹر میڈیٹ پاس کرنے والوں کو مشکوٰۃ یا اسی قسم کی کوئی کتاب مجموعہ حدیث کی پڑھادی جائے اور بی اے پاس کرنے والوں کو فقہ کے متعلق اتنی معلومات حاصل کر لینی چاہئیں جو شرح وقایہ اور ہدایہ کے پڑھنے سے حاصل ہو سکتی ہیں۔

2۔ بعض بزرگوں نے میری تجویز پر اعتراض کیا ہے کہ علوم جدیدہ خصوصاً سائنس اور کیمیا وغیرہ جیسے علوم کی تعلیم بہت پُر مصارف ہے، عربی کے غریب مدارس سے ان مصارف کی پابجائی کیا ممکن ہے؟ لیکن خاکسار یہ کب کہتا ہے کہ عربی مدارس میں ان علوم کی تعلیم کا انتظام کیا جائے، میری تجویز تو یہ ہے کہ دینیات کی تعلیم کو ان مدارس میں منتقل کر دیا جائے جہاں حکومت نے جدید علوم وفنون کی تعلیم کا نظم کر رکھا ہے۔[30]

مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کے تعلیمی افکار یہ تھے کہ ایک ایسا نظامِ تعلیم ہو جس میں مذہبی تعلیمی درجات کو سکولنگ کی طرز پر ڈھال لینا چاہیئے۔ یعنی سکول کے درجات میٹرک، ایف اے، بی اے وغیرہ کا طرز اختیار کیا جانا چاہیئے۔ ہر سطح پر ضروری مذہبی تعلیم یعنی تفسیر، حدیث اور فقہ کے مباحث پڑھانے کا مکمل انتظام ہو اور اس کے ساتھ ساتھ علوم جدیدہ یعنی سائنس اور ٹیکنالوجی کے علوم کو بھی شامل ہونا چاہیئے۔ چونکہ مدارس کے مصارف عوامی تعاون سے پورے ہوتے ہیں، اسلئے سائنس اور ٹیکنالوجی کی اعلیٰ تعلیم کے مصارف اٹھانا مدارس کے لئے مشکل ہو گا، اسلئے سکول ایجوکیشن سسٹم کو اسلامی طرز پر ڈھالنے کی ضرورت ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد

مولانا ابوالکلام آزاد[31]، آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم تھے، جن کی خاص درس نظامی نصاب سے متعلق تو کوئی آراء نہیں ملتیں لیکن نصاب تعلیم کے حوالہ سے ان کے جو نظریات تھے، درس نظامی نصاب کے حامل مدارس ان کو پورا کرتے نظر نہیں آتے۔ جیسا کہ محمد قاسم صدیقی لکھتے ہیں کہ

> "مولانا کے تعلیمی فلسفہ کا بنیادی خیال ہے کہ مشرق و مغرب دونوں کے نظریوں کا علم جاننا ضروری ہے، اور ان میں تال میل کے ذریعہ ہی انسان سائنس کا صحیح استعمال سیکھ سکتا ہے، اسی کے ذریعہ ان مقاصد کا حصول ممکن ہے جو انسانی فطرت کے تقاضوں کی ترجمانی کرتے ہیں،

(ابوالکلام آزاد) علومِ جدیدہ کے دلدادہ ہونے کے باوجود وہ علوم قدیمہ سے بھی اپنا دامن بھر لینا چاہتے تھے۔"[32]

موجودہ دور کے تقاضوں کی روشنی میں درس نظامی نصاب تعلیم میں ترجیحات کا تعین

درج بالا تمام نظریات ہائے نصاب سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ تقریباً تمام تر مفکرین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ نظام تعلیم کی دوئی زہرِ قاتل کا درجہ رکھتی ہے۔ ڈاکٹر محمود احمد غازی لکھتے ہیں کہ "میں یہ بات بلاخوفِ تردید عرض کر سکتا ہوں کہ تعلیم کی وحدت: نظامِ تعلیم کی یکسانیت اور یکجہتی، ملتِ اسلامیہ کی یکجہتی اور یک رنگی کے لئے ایک لازمی شرط ہے۔ ایسی ہر صورتِ حال جس سے مسلمان دو مختلف طبقوں یا ایک سے زائد طبقوں میں تقسیم ہو جائیں، وہ طبقے تعلیم کے نام پر قائم کئے جائیں، وہ طبقے کسی آمدنی کے نام پر قائم کئے جائیں یا رنگ اور نسل کی بنیاد پر قائم کئے جائیں، ان تمام طبقوں اور ان طبقوں کی بنیاد پر الگ الگ تعلیمی، دینی اور مذہبی اداروں کا وجود اسلام کے مزاج کے خلاف اور غیر اسلامی ہے۔ اسلئے میں ذاتی طور پر یہ سمجھتا ہوں کہ ملک میں دینی تعلیم اور غیر دینی تعلیم کے جداگانہ اور بالکل الگ الگ ادارے جس انداز سے قائم ہیں، اس سے ملک و ملت کی وحدت اور یکجہتی متاثر ہو رہی ہے... (نظامِ تعلیم کی) دوئی سیکولرزم کے فروغ میں ممد و معاون ثابت ہو رہی ہے۔"[33] اسلئے نظامِ تعلیم کا ایک ہونا از حد ضروری ہے۔ دورِ حاضر میں وقت کی رفتار اتنی تیز ہو چکی ہے کہ ہر گزرتا لمحہ بھی اپنی علیحدہ اہمیت رکھتا ہے اور درج بالا تعلیمی نظریات آج سے کم از کم پچاس سال قبل تک پیش کئے گئے تھے۔ اس لئے موجودہ دور کے تقاضوں کو مد نظر رکھ کر ترجیحات کے تعین کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر خالد علوی لکھتے ہیں:

> "عصر حاضر کی ضروریات اور چیلنجز کو مدِ نظر رکھ کر بات کی جائے تو یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ درس نظامی مدارسِ اسلامیہ کے زیرِ اثر پروان چڑھنے والی "اسلامی تہذیب اصولی و فکری طور پر مضبوط اور روحانی و اخلاقی اعتبار سے مستحکم ہے لیکن مادی و عسکری اور سائنسی و معاشی لحاظ سے کمزور ہے۔"[34]

مولانا زاہد الراشدی کی پیش کردہ اصلاحات

مولانا زاہد الراشدی صاحب نے دینی مدارس کے نظام و نصاب تعلیم میں عصرِ حاضر کے حوالے سے جو اصلاحات، ترامیم اور اضافے تجویز کئے ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے کہ

1۔ مدارس میں ایسا نظامِ تعلیم رائج کرنا چاہیئے کہ فضلاءِ مدارس اردو اور عربی میں مہارت رکھتے ہوں اور انگریزی سے کم از کم اتنا تعلق ضرور ہو کہ لکھی ہوئی چیز کو پڑھ کر اپنے الفاظ میں بیان کر سکے۔

2۔ مدارس کے نصاب میں اسلامی تاریخ کو بطورِ جزو لازم شامل کیا جائے تاکہ فضلاء مدارس اپنے اسلاف کی تاریخ سے مکمل آگاہ ہوں، جس کا رائج نصاب میں کوئی بندوبست نہیں ہے۔

3۔ اسلام کی صحیح ترجمانی کے لئے نصابِ تعلیم میں تقابلِ ادیان اور معاصر فلسفہ ہائے حیات کو ضرور شامل ہونا چاہیئے۔

4۔ تاریخِ فقہ تعارف اور افہام و تفہیم کی غرض سے پڑھائی جائے نہ کہ مناظرانہ طرز پر۔

5۔ مدارس کے نصاب میں جدید علوم کو بھی شامل کیا جائے۔

6۔ اسلامی نظامِ حیات کو بطورِ مضمون نصاب کا حصہ بنایا جائے اور اس پر فکرِ جدید کی جانب سے کئے جانے والے اعتراضات و شبہات کو سامنے رکھتے ہوئے طلبہ کو شعوری طور پر اسلامی نظام کی ترجمانی کے لئے تیار کیا جائے۔

7۔ ابلاغِ عامہ کے تمام ذرائع بشمول کمپیوٹر و دیگر آلاتِ جدیدہ میں فضلائے مدارس کی مہارت پیدا کرنی چاہیئے تاکہ مختلف محازوں پر مقابلہ کیا جاسکے۔

8۔ باصلاحیت فضلاء کے لئے عربی، انگریزی، فرانسیسی اور فارسی میں تخصص کا اہتمام کیا جائے۔[35]

ڈاکٹر خالد علوی صاحب کے مطابق موجودہ درسِ نظامی کو عصری تقاضوں سے دو طرق سے ہم آہنگ کیا جا سکتا ہے۔ اول یہ کہ ایف اے تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد چار یا 5 پانچ سالہ منظور شدہ کورس ان طلبہ کو پڑھانے کے بعد انہیں ایم اے کی سند سے نوازا جائے، اسے وہ یکجہتی اسکیم کا نام دیتے ہیں۔ دوم یہ کہ مدارس کے نصاب میں سوشل سائنسز، انگریزی اور تقابل ادیان کو شامل کر کے ہر دو سال بعد مدارس کے اس منتخب نصاب سے انہیں ایف اے، بی اے اور ایم اے کرا دیا جائے۔[36]

ڈاکٹر نیاز محمد درس نظامی نصابِ تعلیم کے حوالے سے سفارشات مرتب کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ قرینِ مصلحت یہ ہے کہ صدیوں (کی) قدیم کتابوں کو ان کی بجائے استخراجی بنیادوں پر لکھی گئی جدید اور عام فہم کتابوں کو Recommend کیا جائے۔ دوم دینی تعلیم کی تمام سطحوں پر نصاب میں عصرِ حاضر کے مناسبِ حال مضامین شامل ہوں اور معاصر موضوعات و مسائل زیر بحث آنے چاہئیں تاکہ طلبہ ان مسائل و مباحث کو اسلامی تعلیمات کے مطابق حل کرنے کے قابل ہوں۔[37]

پروفیسر بختیار حسین صدیقی درسِ نظامی نصابِ تعلیم کو عصرِ حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی خاطر رقمطراز ہیں:

> "علماء انبیاء کے وارث ہیں، انہوں نے فلسفے کے چیلنج کا تو مؤثر جواب دیا لیکن سائنس کے چیلنج کا جواب دینے کے لئے وہ میدان ہی میں نہیں اترے۔ اس کا ان پر حد درجہ منفی رد عمل ہوا۔ وسیع

النظری چھوڑ کر انہوں نے تنگ نظری کو اپنا شعار بنا لیا۔ اجتہاد کی بجائے انہوں نے تقلید پر قناعت کر لی۔ حرکت کی بجائے جمود پر اکتفاء کیا۔ انہوں نے سائنس کا مطالعہ کر کے جواباً علمِ کلام کی طرح کوئی نیا علم ایجاد نہیں کیا جو مذہب کو استقرائی بنیاد پر استوار کرتا اور خلا کی تسخیر اور چاند کی فتح کر کے اِس دور میں اُس کی بالادستی قائم رکھتا۔ قرآن کی واضح یاددہانی کے باوجود انہوں نے مشاہدہ پر مبنی سائنس کو نصاب میں داخل نہیں کیا۔ نصابِ درسِ نظامیہ میں دو مرتبہ ترمیم و تبدیلی ہوئی لیکن عمرانی اور طبعی علوم اس میں جگہ نہ پا سکے۔ ارسطو کی الٰہیات اور منطق، اور فور فریوس (PORPHYRY) کا اس کی منطق پر مقدمہ ایساغوجی (ISAGOGE) کے نام سے مشہور ہے اگر درسِ نظامیہ کا لازمی جزو بن سکتے ہیں تو آئن سٹائن کا نظریہ اضافیت، ہائزن برگ کا اصول عدمِ تعین، جیمس جینز اور رد جر اینڈ نگٹن کی مادہ گریز طبیعات اس کی زینت کیوں نہیں بن سکتیں۔ تسخیر قمر کی اس صدی میں ہمارے مدارس میں آج بھی قرونِ وسطیٰ کا نصاب پڑھایا جارہا ہے، حالانکہ اس کی بجائے نصاب کو استقرائی علوم پر ہونا چاہیئے۔"[38]

درسِ نظامی نصابِ تعلیم کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کا مقصد ہرگز یہ نہیں ہے کہ اسلامی طرزِ تعلیم کو ختم کر کے صرف اور صرف سائنسدان، اکانومسٹ، جیولوجسٹ، فزیشنز، سرجنز، ماہرین ٹیکنالوجی، انجینئرز پیدا کئے جائیں بلکہ اس نظامِ تعلیم کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ ثنویتِ تعلیم کا جو تصور راسخ ہو چکا ہے اور دینی اور دنیاوی ایک دوسرے کے متوازی نظام ہائے تعلیم اپنا وجود قائم کر چکے ہیں، ان کو بالکل ختم نہیں کیا جا سکتا۔ اسلئے اب ان میں بہتری اور اصلاح کی راہ تجویز کرنی ہے۔ ان دونوں نظام ہائے تعلیم میں سے اس وقت صرف ایک ہی نظام منتظمینِ حکومت، ماہرینِ معیشت، ماہرینِ سائنس اور ٹیکنالوجی، ڈاکٹرز، انجینئرز وغیرہ غرض ہر شعبہ زندگی کے لئے رجالِ کار پیدا کرنے کا سبب بن چکا ہے اور ضمام اقتدار اُسی نظامِ تعلیم کے فارغ التحصیل حضرات کے ہاتھ میں جا چکی ہے۔ ضرورت اِس امر کی ہے کہ چونکہ اس کے متوازی دوسرا نظامِ تعلیم جو دینی اقدار و روایات کا حامل ہے، صدیوں تک ایسے رجالِ کار پیدا کرنے کا سبب رہا ہے اور موجودہ دور میں برصغیر کے حوالے سے خصوصاً اور پوری ملتِ اسلامیہ کے حوالے سے عموماً وہ اپنی عصری معنویت کھوتا جارہا ہے۔ یہی وہ بانجھ پن ہے جس کی وجہ سے برصغیر کے اکثریت مسلم مفکرین نے اس نظام کو ضروریاتِ وقت سے ہم آہنگ کرنے کے نظریات وقتاً فوقتاً پیش کئے ہیں۔

نتائج وسفارشات

اس مطالعہ سے درج ذیل نتائج حاصل ہوئے ہیں۔

1۔ درسِ نظامی نصابِ تعلیم مذہبی حوالے سے مستحکم بنیادیں رکھتا ہے اور باوجود مذہبی ضروریات پورا کرنے کے عصری تقاضوں سے ہم آہنگی کی خاطر اصلاح کا متقاضی ہے۔

2۔ اسلامی نقطہ نظر سے دین اور دنیا کو علیحدہ نہیں کیا جا سکتا، اسلئے نظام تعلیم کی دوئی (ثنویت) زہر قاتل کا درجہ رکھتی ہے، جس کی وجہ سے تمام مسلم مفکرینِ ہند نے ایسے طرزِ تعلیم کی مخالفت کی ہے۔

3۔ انگریزی زبان یا کوئی بھی دوسری زبان سیکھنے میں کوئی حرج نہیں، اس پر نہ تو کوئی مذہبی فتویٰ ہے اور نہ ہی کوئی دوسرا قدغن۔

4۔ کسی بھی نصابِ تعلیم کا خاصا یہ ہونا چاہیئے کہ اس سے جہاں ایک طرف اسلامی عقائد و نظریات میں رسوخ پیدا ہو، وہیں وہی نظام اعلیٰ سائنسی و جدید تعلیم کا ذریعہ بھی ہو۔ تاکہ مسٹر اور مُلا کا فرق ختم ہو سکے۔ جبکہ دور حاضر کے درس نظامی نظام تعلیم میں سائنسی و جدید تعلیم کا سرے سے کوئی تصور بھی موجود نہیں ہے۔

5۔ درسِ نظامی نصابِ تعلیم کو معصریت سے ہم آہنگ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ جدید علوم و فنون کو اس نظامِ تعلیم میں شامل کیا جائے۔

حواشی و حوالہ جات

1۔ جالندھری، محمد حنیف (قاری)، وفاق المدارس–ایک عہد ساز ادارہ مشمولہ وفاق المدارس العربیہ پاکستان (ساٹھ سالہ تاریخ)، مرتب: ابن الحسن عباسی، مرکزی دفتر وفاق المدارس العربیہ پاکستان، ملتان، ص:41

2۔ بعض روایات کے مطابق یہ آپس میں زمیندارانہ تنازعہ تھا اور بعض کے مطابق (اورنگزیب عالمگیر کو اپنے وقت کے اس عظیم ماہر علوم عقلیہ و نقلیہ سے انتہائی عقیدت تھی اور یہی وجہ تھی کہ اورنگزیب اپنے امراء اور حکام کو ملا قطب الدین کی خدمت میں بھیجا کرتا تھا) مقامی زمینداروں نے اس ڈر سے کہ کہیں ملا قطب الدین انصاری انکی بدمعاشیوں کو بادشاہ کے علم میں نہ لے آئیں اور یوں ان پر عتابِ شاہی نازل ہو جائے۔ اس سے بچنے کی خاطر ایک سازش کر کے ملا قطب الدین کو شہید کروا دیا اور ان کے محل سرائے، مدرسہ و دیگر املاک کو جلا دیا گیا تاکہ اسے بلوہ عام کہا جا سکے۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے: محمد رضا انصاری فرنگی محلی، بانیٔ درسِ نظامی، انصاری فاؤنڈیشن فیض پور خورد شیخوپورہ، ص:19-29 / مولانا شبلی نعمانی، مقالات شبلی، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ یو پی، انڈیا، 2009ء، 3/120-144)

3۔ زاہد الراشدی (مولانا)، درس نظامی کا پس منظر مشمولہ روزنامہ اسلام، لاہور، اشاعت: 28 جولائی، 2017ء

4۔ شبلی نعمانیؒ لکھتے ہیں کہ "درس نظامی اگرچہ خاص ہندوستان کا کارنامہ فخر ہے لیکن نظام الملک نے بغداد میں جو مدرسہ اعظم "نظامیہ" کے نام سے قائم کیا تھا اس کی عالمگیر شہرت نے اِس قدر دست درازی کی کہ اس سلسلے کو بھی اپنے اعمال میں داخل کرنا چاہا، چنانچہ ہمارے زمانے کے اکثر ناواقفوں کو دھوکا ہوا" (مولانا شبلی نعمانی، مقالاتِ شبلی، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ یو پی، انڈیا، 2009ء، 3/111)

5۔ رائے نذر الحفیظ، عربی اسلامی مدارس کا نصاب و نظامِ تعلیم اور عصری تقاضے مشمولہ مدرسہ سسٹم چند مشورے، خدا بخش اورینٹل و پبلک لائبریری پٹنہ، بھارت، 1995ء، ص:37

6۔ العجلونی، الشیخ اسماعیل بن محمد (المحدث)، کشف الخفاء ومزیل الإلباس عما اشتھر من الأحادیث علی ألسنۃ الناس، مکتبۃ القدسی القاہرہ، مصر، س ن، الجزء الثانی، ص:311

7 جالندھری، محمد حنیف (قاری)، وفاق المدارس - ایک عہد ساز ادارہ مشمولہ وفاق المدارس العربیہ پاکستان (ساٹھ سالہ تاریخ)، ص42-43

8۔ نعمانی، شبلی (مولانا)، مقالاتِ شبلی، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ یوپی، انڈیا، 2009ء، 3/106

9۔ http://www.farooqia.com/ur/lib/1437/02/p23.php

10۔ جالندھری، محمد حنیف (قاری)، وفاق المدارس- ایک عہد ساز ادارہ مشمولہ وفاق المدارس العربیہ پاکستان (ساٹھ سالہ تاریخ)، ص:40

11۔ شجاع احمد، حکیم، خوں بہا، حصہ اوّل، فیروز سنز پرنٹرز پبلیشرز بک سیلرز اینڈ اسٹیشنرز، لاہور پاکستان، طبع دوم، 1950ء، ص:439

12۔ انگریزی نظام تعلیم کے اثرات سے متعلق علامہ مودودی کے بھی ایسے ہی خیالات تھے جس کا ذکر ان الفاظ میں ہے "1935ء میں یہ سوال بڑے زور و شور سے اٹھایا گیا کہ آخر مسلمانوں کی قومی درس گاہوں سے ملاحدہ اور الحاد و دہریت کے مبلغین کیوں اس کثرت سے پیدا ہو رہے ہیں۔ علی گڑھ یونیورسٹی کے بارے میں خصوصیت کے ساتھ یہ شکایت تھی کہ اس سے فارغ التحصیل ۹۰ فیصد طلباء الحاد و دہریت میں مبتلاء ہیں۔" آگے علی گڑھ یونیورسٹی کے طلبہ سے متعلق لکھتے ہیں "افسوس یہ ہے کہ یونیورسٹی کے فارغ التحصیل اور زیر تعلیم طلباء میں ایک بڑی تعداد ایسے نوجوانوں کی پائی جاتی ہے جن کا وجود اسلامی تہذیب اور مسلمانوں کے لئے نفع نہیں، بلکہ الٹا نقصان ہے۔ یہ لوگ روحِ اسلامی سے ناآشنا ہی نہیں بلکہ اس سے قطعاً منحرف ہو چکے ہیں۔ ان میں مذہب کی طرف سے سرد مہری ہی نہیں بلکہ نفرت سی پیدا ہو گئی ہے۔ اس کے ذہن کا سانچہ ایسا بنا دیا گیا ہے کہ تشکیک کی حد سے گزر کر انکار کے مقام پر پہنچ گئے ہیں اور اصول اولیہ کے خلاف بغاوت کر رہے ہیں جن پر اسلام کی بنیاد قائم ہے۔" (سید ابو الاعلیٰ مودودی، تعلیمات، اسلامک پبلیکیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، ۳۔ لوئر مال روڈ لاہور، ستمبر 1971ء، ص:9-17)

13۔ زاہد الراشدی، ابو عمار، مولانا، شیخ الہند کا تعلیمی نظریہ، مشمولہ روزنامہ اسلام، لاہور، 23، 24 دسمبر، 2011ء

14۔ نعمانی، مولانا شبلی، مقالاتِ شبلی، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ یوپی، انڈیا، 2009ء، 3/107

15۔ آپ کی پیدائش ۵ ذی الحجہ 1232ھ بمطابق ۱۷ اکتوبر 1857ء کو دلی میں خواجہ فرید حویلی کے حصہ خواص پورہ میں ہوئی۔ آپ کے خاندان کو دہلی میں ایک علمی و مذہبی گھرانے کی حیثیت حاصل تھی۔ آپ کا نام احمد رکھا گیا۔ آپ کے والد کا نام سیّد میر متقی جبکہ والدہ کا نام عزیز النساء بیگم تھا۔ والد کی طرف سے آپ حسینی سید ہیں۔ آپ کے آباؤ اجداد عرب سے ہجرت کر کے ایران کے قدیمی شہر دامغان میں آکر آباد ہو گئے تھے۔ آپ کے دادا کا نام سید ہادی جواد الدولہ جواد علی خان بہادر، پردادا سید عماد، چھر دادا سید برہان اور مورث اعلیٰ کا نام سید محمد دوست تھا۔ آپکی والدہ دبیر الدولہ امین الملک خواجہ فرید الدین احمد خان بہادر مصلح جنگ کی بیٹی تھی۔ سید خاندان کی نسبت سے آپ نے اپنے نام میں سید کا اضافہ کیا جبکہ سر اور خان آپ کے خطابات تھے۔ آپ مصنف کتبِ کثیرہ تھے۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے: جمیل یوسف، سر سید احمد خان۔ ابلاغ پبلیشرز، اردو بازار لاہور، 2002ء، ص:29/ ایثار حسین، ہندوستان

کے عظیم لوگ۔ بک ہوم، مزنگ سٹریٹ لاہور، 2007ء، ص:182 / عبدالحئی، اردو صحافت اور سر سید احمد خان، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2008ء، ص:60)

16۔ خویشگی، محمد عبداللہ خان، مقالاتِ سر سید، نیشنل پرنٹرز کمپنی علی گڑھ، 1952ء، ص:81

17۔ ایضاً، ص:78

18۔ ایضاً، ص:79

19۔ لاہوری، ضیاءالدین، خود نوشت افکار سر سید، فضلی سنز لمیٹڈ اردو بازار کراچی، 1998ء، ص:206

20۔ مولانا حسین احمد مدنی کی ولادت ۱۹ شوال ۱۲۹۶ھ بانگڑمؤ ضلع اناؤ میں ہوئی، آبائی وطن الہداد پور قصبہ ٹانڈہ ضلع فیض آباد، ہند ہے۔ تاریخی نام چراغ محمد ہے۔ آپ حسینی سید ہیں۔ آپ کے والد کا نام سید حبیب الرحمٰن تھا۔ آپ نے دارالعلوم دیوبند میں تعلیم حاصل کی۔ کچھ عرصہ تک حجاز مقدس میں بھی تدریسی خدمات سرانجام دیں، پھر واپس آگئے اور ہندوستان میں تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ آپ تحریک آزادی کے مقتدر راہنماؤں میں سے ہیں اور اسی سلسلہ میں جزیرہ مالٹا کی قید بھی گزاری۔ آپ کی وفات 5 دسمبر 1957ء دیوبند میں ہوئی۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے: سید محمد اکبر شاہ بخاری، اکابر علماء دیوبند، ادارہ اسلامیات لاہور، کراچی، جنوری 1999ء، ص:12-119)

21۔ تفصیل کے لئے دیکھئے: مدنی، حسین احمد، نصابِ مدنی مشمولہ البرہان، شمارہ جون 2013ء، تجزیہ و توضیح: ڈاکٹر محمد امین، مکتبہ البرہان 389 نیلم بلاک علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور، ص:9-22

22۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی کا سنِ ولادت 1321ھ بمطابق 1903ء ہے۔ جائے پیدائش اورنگ آباد دکن ہے اور آبائی تعلق سادات کے ایک ایسے خاندان سے ہے جو ابتداء میں ہرات کے قریب چشت کے معروف مقام پر آکر آباد ہوا تھا۔ اس خاندان کے ایک مشہور بزرگ خواجہ قطب الدین مودود چشتی تھے جو خواجہ معین الدین چشتی اجمیری کے شیخ الشیوخ تھے۔ سید مودودی کا خاندان خواجہ مودود چشتی کے نام نامی سے منسوب ہو کر ہی مودودی کہلاتا ہے۔
http://jamaat.org/ur/bani_intro.php مورخہ: 24 فروری 2019ء بوقت 7 بجے شام)

23۔ مودودی، ابوالاعلیٰ، سید، تعلیمات، اسلامک پبلیکیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، 3۔ لوئر مال روڈ لاہور، ستمبر 1971ء، ص:25-26

24۔ ایضاً، ص:65

25۔ ایضاً، اسلامی نظام تعلیم، اسلامک پبلیکیشنز لاہور، 1970ء، ص:1

26۔ ایضاً، تعلیمات، ص:17-18

27۔ تفصیل کے لئے دیکھئے: سید ابوالاعلیٰ مودودی، تعلیمات، ص:26-40

28۔ مولانا مناظر احسن گیلانی 1892ء کو استھانواں پٹنہ ضلع، بہار میں پیدا ہوئے۔ آپ کے مورثِ اعلیٰ سید علی جاجنیری کا تعلق مدینہ منورہ کے قریب واسط سے تھا۔ آپ کے والد کا نام سید ابوالخیر تھا۔ آپ نے قرآن، اردو، فارسی نحو و صرف ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں گیلانی میں مکمل کی۔ بمطابق 1906ء سے 1331ھ بمطابق 1913ء تک مدرسہ خلیلیہ ٹونک (راجستھان) میں مختلف علوم و 1324 فنون منطق، فقہ، ادب اور ہیئت و ریاضی کی کتابیں پڑھیں۔ 1331ھ میں ایشیا کی عظیم اسلامی درسگاہ دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا اور ماہرین علوم و فنون سے بھرپور استفادہ کیا، جن میں سرِ فہرست شیخ الہند مولانا محمود الحسن، علامہ انور شاہ کشمیری، علامہ شبیر احمد عثمانی، شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی وغیرہ شامل ہیں۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے: ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہان پوری، مولانا سید مناظر

احسن گیلانی (شخصیت و سوانح)، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ، انڈیا، 2002ء / مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحی، حیات مولانا گیلانی، مجلس نشریاتِ اسلام ناظم آباد کراچی، 1944ء)

29۔۔ گیلانی، مناظر احسن، مقالات گیلانی، ص:201

30۔ گیلانی، مناظر احسن، مولانا، نظامِ تعلیم کی وحدت مشمولہ ماہنامہ البرہان، لاہور، اگست 2011ء، ص:9-10

31۔ ابوالکلام محی الدین احمد آزاد: (پیدائش ۱۱ نومبر 1888ء-وفات 22 فروری 1958ء) اصل نام محی الدین احمد تھا ان کے والد بزرگوار محمد خیر الدین انہیں فیروز بخت (تاریخی نام) کہہ کر پکارتے تھے۔ مولانا 1888ء میں مکہ معظمہ میں پیدا ہوئے۔ والدہ کا تعلق مدینہ سے تھا۔ سلسلہ نسب شیخ جمال الدین سے ملتا ہے جو اکبر اعظم کے عہد میں ہندوستان آئے اور یہیں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ 1857ء کی جنگ آزادی میں آزاد کے والد کو ہندوستان سے ہجرت کرنا پڑی کئی سال عرب میں رہے۔ مولانا کا بچپن مکہ معظمہ اور مدینہ میں گزرا۔ ابتدائی تعلیم والد سے حاصل کی۔ پھر جامعہ ازہر (مصر) چلے گئے۔ چودہ سال کی عمر میں علوم مشرقی کا تمام نصاب مکمل کر لیا تھا۔ مولانا کی ذہنی صلاحتیوں کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ انہوں نے پندرہ سال کی عمر میں ماہوار جریدہ لسان الصدق جاری کیا۔ 1914ء میں الہلال نکالا۔ یہ اپنی طرز کا پہلا پرچہ تھا۔ ترقی پسند سیاسی تخیلات اور عقل پر پوری اترنے والی مذہبی ہدایت کا گہوارہ اور بلند پایہ سنجیدہ ادب کا نمونہ تھا۔ مولانا بیک وقت عمدہ انشا پرداز، جادو بیان خطیب، بے مثال صحافی اور ایک بہترین مفسر تھے۔ اگرچہ مولانا سیاسی مسلک میں کانگرس کے ہمنوا تھے لیکن ان کے دل میں مسلمانوں کا درد ضرور تھا۔ آپ آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم تھے۔ 22 فروری 1957ء کو انتقال ہوا۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے: عبد الرشید عراقی، مولانا ابوالکلام آزاد بحیثیت صحافی و مفسر، نعمانی کتب خانہ حق سٹریٹ اردو بازار لاہور، 2004ء)

32۔ صدیقی، محمد قاسم، مولانا آزاد اور تعلیم مشمولہ فکر و نظر (خصوصی شمارہ: مولانا آزاد نمبر)، اگست 1989ء، ص:165

33۔ غازی، محمود احمد (ڈاکٹر)، دینی مدارس: مفروضے، حقائق، لائحہ عمل مشمولہ دینی مدارس میں تعلیم، مؤلف: سلیم منصور خالد، انسٹیٹیوٹ آف پالیسی سٹڈیز ایف سیون اسلام آباد، 2002ء، ص:62

34۔ خالد علوی (ڈاکٹر)، تعلیم اور جدید تہذیبی چیلنج، دعوۃ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد، 2005ء، ص:5

35۔ زاہد الراشدی، مولانا، دینی نظامِ تعلیم اصلاح کی حکمتِ عملی مشمولہ دینی مدارس میں تعلیم، مؤلف: سلیم منصور خالد، ص:51-58

36۔ خالد علوی (ڈاکٹر)، دینی نظامِ تعلیم، اصلاح کی حکمتِ عملی مشمولہ دینی مدارس میں تعلیم، مؤلف: سلیم منصور خالد، ص:48

37۔ نیاز محمد (ڈاکٹر)، درس نظامی کے نصاب تعلیم اور اصولِ نصاب سازی کا جائزہ مشمولہ پشاور اسلامیکس، 2، شمارہ 2، جولائی دسمبر 2011ء، پشاور پاکستان

38۔ صدیقی، بختیار حسین (پروفیسر)، برصغیر پاک و ہند کے قدیم عربی مدارس کا نظام تعلیم، ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کلب روڈ لاہور، 1982ء، ص:35